اسلام کا بین الاقوامی قانون ' ایک تقابلی جائزہ ۔ ۲

محمود احمد غازی

دنیا کے مختلف علاقوں میں بین الاقوامی قوانین کے آغاز و ارتقا کے تقابلی مطالعے سے چند باتیں بنیادی طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں: ایک یہ کہ کسی بھی قوم نے ماسوائے مسلمانوں کے بین الاقوامی انصاف کی بنیاد پر دنیا کو کوئی قابل عمل عالمی نظام نہیں دیا۔

دوسرے یہ کہ ان تمام نظاموں نے دنیا میں انسانوں کو طبقات میں تقسیم کیے رکھا۔ کہیں دو حصوں میں' کہیں تین حصوں میں' اور کہیں چار حصوں میں۔ اس تقسیم میں طاقتور گروہ کو بے تحاشا اختیارات حاصل تھے اور کمزور ہر قسم کے حقوق سے محروم تھا۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن پاک نے واضح طور پر غلط قرار دیا۔ فرعون کے بارے میں فرمایا' إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (القصص ۲۸:۴) واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا' اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ قرآن نے اس کردار کے شخص کے بارے میں اعلان کیا إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ کہ وہ فساد پھیلانے والوں میں سے تھا' چنانچہ قرآن کی نظر میں ہر وہ نظام خواہ داخلی ہو یا خارجی' جو انسانوں کے درمیان مساوات کی بجائے درجہ بندی پر ایمان رکھتا ہو' جہاں دولت مند اور بااثر لوگ ہی حقوق و مراعات سے متمتع ہوتے ہوں اور باقی لوگ ثانوی حیثیت رکھتے ہوں' فرعونی نظام ہے۔

تیسری چیز جو ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ ان تمام قوانین میں بین الاقوامی قانون کا دائرہ کار صرف اس حد تک محدود رہا کہ جنگ کی صورت میں مقتولین سے کیا معاملہ کیا جائے' مقتولین کی جائیداد کو کس طرح سے استعمال کیا جائے اور فاتحین ایک سے زاید ہوں تو مقتولین کی جایداد کو ان کے درمیان کس طرح تقسیم کیا جائے۔

یہ وہ بنیادی چیزیں تھیں جو تقریباً تمام بین الاقوامی قوانین کی اساس تھیں۔ مہابھارت اور رامائن سے

لے کر ارتھ شاستر اور منو سمرتی تک ہندوؤں کے ہاں تمام کتابیں جن کو آج کل کے ہندو مصنفین بین الاقوامی قانون کا قدیم ماخذ قرار دیتے ہیں، ان سب میں یہی ہے کہ اگر کوئی قوم مفتوح ہو جائے تو اگر فاتح کے مقابلے میں نسلی اعتبار سے برابر کی ہے تو اس سے اس طرح کا سلوک کیا جائے، اگر کم تر درجے کی ہے تو اس سے اس طرح کا سلوک کیا جائے۔ پورا نظام مساوات کی بجائے انسانوں کی تفریق و تقسیم پر مبنی ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے جو کچھ دیا، وہ فقہ و شریعت کے طلبہ سے مخفی نہیں ہے۔ میدان علم میں یورپ کے تمام تر ارتقا کے باوجود اسلام کا بین الاقوامی تعلقات کا قانون آج بھی اتنا متوازن، معتدل اور مبنی بر انسانیت ہے کہ ابھی مغرب کو وہاں تک پہنچنے میں نہ معلوم کتنی صدیاں درکار ہیں۔ یورپ نے میونسپل لا میں جو کچھ ابھی حاصل نہیں کیا، اسلام نے اس سے بھی آگے جا کر اسے اپنے انٹرنیشنل لا میں سمو دیا ہے۔ ملک کے اندر بغاوت سے نمٹنا اور اس سے عہدہ برآ ہونا دنیا کے تمام قوانین میں موجود ہے اور کریمنل لا کا موضوع ہے۔ لیکن شریعت اسلامی کی رو سے یہ خالصتاً بین الاقوامی قانون (علم سیر) کا موضوع ہے۔ اسی طرح سے محاربین اور قزاقوں سے نمٹنا دنیا کی نظر میں داخلی فوجداری قانون کا موضوع ہے لیکن اسلام کے ہاں قزاقوں اور محاربین کا مسئلہ (فقہ سیر) انٹرنیشنل لا کا موضوع ہے۔ داخلی طور پر بغاوتوں سے نمٹنا دنیا میں فوجداری قانون کا موضوع ہے، لیکن اسلامی قانون کے مطابق یہ بین الاقوامی قانون کا موضوع ہے۔

اس سلسلے میں اسلام نے منعہ کا اصول دیا ہے، یعنی ہر وہ گروہ جو کسی ایسے نظریے یا اصول سے وابستگی کی بنیاد پر قوت حاصل کرتا ہے جو قرآن مجید یا سنت کے کسی اصول کی تاویل پر مبنی ہو، اس کے لیے الگ قوانین ہیں۔ ایک فرد اگر ریاست اور معاشرے کے خلاف تلوار اٹھاتا ہے تو اس کے لیے الگ قانون ہے۔ اسی طرح جو گروہ کسی نظریے یا عقیدے کے اختلاف کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے، اس پر بغاوت کے عام احکام نافذ نہیں ہوتے، بلکہ اس کے لیے فقہا نے تاویل کے احکام بیان کیے ہیں۔ ان کے ساتھ معاملہ نمٹانے کے الگ قوانین ہیں، جس میں ان کے اصول و نظریات کا احترام بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ نے خوارج کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ رکھا حالانکہ خوارج کے نظریات قرآن سے متصادم تھے۔ خوارج کے نظریات سے صحابہ نے کبھی اتفاق نہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود ان کے نظریات کا احترام کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے ان کو واضح طور پر لکھا کہ جب تک تم بدامنی پیدا نہیں کرتے اور جب تک تم لوگوں کے جان و مال کے لیے خطرہ نہیں بنتے، تمھارے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا جائے گا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اہل علم صحابہؓ کو ان کے نظریے کی اصلاح کے لیے بھیجا، اور طویل عرصے تک گفت و شنید اور اصلاح کی کوششوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مشہور ادیب اور مورخ ابو العباس المبرد نے اپنی تالیف "الکامل فی اللغہ والادب" میں خوارج اور عبداللہ بن عباسؓ کے درمیان ہونے والی اس طویل گفتگو کو جو مختلف ادوار پر مشتمل ہے، مکمل طور پر نقل

کیا ہے۔ اس گفتگو کی تفصیلات سے پتا چلتا ہے کہ داخلی جھگڑے اور سیاسی اختلاف کو حل کرنے کا اسلامی ڈھنگ کیا ہے اور یہ کہ صحابہ کرام نے خوارج کے ساتھ اپنے مذہبی اور سیاسی اختلافات کو پرامن طریقے سے طے کرنے کے لیے کیسی کیسی کوششیں کیں۔ بہرحال باغیوں اور محاربوں سے نبٹنا اسلامی نظام قانون کی رو سے قانون بین الاقوام ہی کا حصہ ہے۔

جب ہم بین الاقوامی قانون کے مصادر و مراجع کی طرف آتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی قوانین مرتب ہوئے' وہ سب کے سب بالعموم اور بین الاقوامی قوانین بالخصوص' ان سب کی ابتدا رسوم و رواج سے ہی ہوتی ہے۔ یہ رسوم و رواج طویل عرصہ جاری رہتے ہیں' جن کا آغاز کسی نہ کسی وقت کسی بااثر فرد یا بااختیار حاکم کے کسی نہ کسی من مانے فیصلے سے ہوتا ہے۔ عموماً یہ ایک صوابدیدی فیصلہ ہوتا ہے جس میں انصاف کم اور حاکم کی قوت و حشمت کو دخل زیادہ ہوتا ہے' اور یہ فیصلہ کمزور کو اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔ لیکن آگے چل کر یہی فیصلہ آنے والوں کے لیے ایک دلیل اور نظیر بن جاتا ہے اور یوں وہ قانون کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہی رسم و رواج اور ان کا یہی ارتقا بین الاقوامی قانون میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے قانون بین الاقوام کی بنیادوں اور اساسی تصورات اور تعلیمات کی تشکیل میں کسی رسم و رواج کو دخل نہیں ہے۔ وہ کسی علاقے کا طور طریقہ یا کسی حاکم کا صوابدیدی یا من مانا فیصلہ نہیں۔ اسلام کے قانون بین الاقوام کی بنیاد تو ایک متعین اور ایک منضبط کتاب ہے جو قرآن پاک ہے' ایک منضبط عدالت کا فیصلہ ہے جو عدالت محمدیہؐ کہلاتی ہے۔

اسلام کا بڑے سے بڑا مخالف شاید یہ تو کہہ سکتا ہے کہ قرآن الہامی کتاب نہیں ہے' کوئی یہودی اور عیسائی اس کے منجانب من اللہ ہونے سے تو شاید انکار کر سکتا ہے' لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کتاب ایک مدون اور طے شدہ قانون کی شکل میں ابتدا میں موجود نہ تھی۔ یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں بیان کردہ قوانین کی ابتدا رسوم و رواج سے ہوئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں بیان کردہ بیشتر اصول پہلی بار اسی کتاب کی شکل میں سامنے آئے اور اسی کتاب نے پہلی بار دنیا میں انھیں متعارف کرایا۔ اس لیے جیسا کہ آج قانون دان کہتے ہیں کہ غیر معین (undefined) قانون کے مقابلے میں معین (defined) قانون زیادہ بہتر ہے اور پایدار ہے' یہ (قرآن) تو آغاز ہی سے ایک defined اور مہذب قانون تھا' اور ایک مہذب قانون کی تمام شرائط کو پورا کرتا تھا۔ اس کے بالمقابل دیگر قوانین غیر مہذب' غیر معین اور undefined تھے۔

ان تمام قوانین و اقوام میں عوام کے لیے الگ قانون تھا اور خواص کے لیے الگ قانون تھا۔ اپنوں کے لیے الگ قانون ہوتا تھا اور غیروں کے لیے الگ۔ یونانیوں کے ہاں تصور یہ تھا کہ ہم وطنوں کے لیے تو طے شدہ قوانین موجود ہیں' لیکن بقیہ تمام انسانوں کے لیے ہم اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ رومیوں

نے بھی یہی طے کیا تھا کہ رومیوں کے حلیف فرمانرواؤں یعنی یورپ کے حکمرانوں کے لیے ایک طے شدہ قانون ہو گا اور بقیہ تمام انسانوں کے لیے فاتحین اور زور آوروں کی صوابدید پر فیصلہ کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں مغربی دنیا میں جو قانون مرتب کیے گئے وہ صرف عیسائیوں کے لیے تھے۔ غیر عیسائیوں کے لیے صوابدیدی فیصلے ہوتے تھے۔ حکمران اپنی فوجی قوت اور ذہنی استعداد کے مطابق ان (غیر عیسائیوں) کے بارے میں فیصلہ کر سکتا تھا۔ آج بھی یورپ کے بین الاقوامی قوانین میں مہذب دنیا (civilized World) اور غیر مہذب دنیا (uncivilized World) کی تقسیم موجود ہے، جس کو وہاں بین الاقوامی قانون کے جد امجد نے بھی قانون کی کامیابی کی ایک شرط قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ فیصلہ کہ مہذب کون ہے، اور غیر مہذب کون، وہاں کے حکمران کرتے ہیں۔ وہ جس کو چاہیں مہذب قرار دے دیں اور جس کو چاہیں غیر مہذب قرار دے دیں۔ اس کا مشاہدہ آج کے بین الاقوامی معاملات میں کسی بھی اخبار کے بین الاقوامی خبروں کے صفحات پر کیا جا سکتا ہے۔ یورپ میں یہ چیز نئی نہیں ہے بلکہ یہ ان کے ماضی کا تسلسل اور اصول قانون کی بنیاد ہے۔

اس کے برعکس آپ اسلام کے قانون کی طرف آیئے تو آپ دیکھیں گے کہ اسلام نے بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل، مہذب و غیر مہذب سب کو ایک یکساں اور مکمل قانون، قرآن کی صورت میں دے دیا۔ اور صوابدیدی اختیارات کو قطعاً روا نہیں رکھا۔ پھر اس قانون میں اس نے ترمیم و تنسیخ کا اختیار کسی بڑے سے بڑے فرد حتیٰ کہ پیغمبر اسلام کو بھی نہیں دیا۔ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس کے کسی حکم میں کمی بیشی کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ صوابدیدی اختیارات کے خاتمے کی ایسی اعلیٰ مثال دنیا کے کسی قانون یا قوم میں ہمیں نہیں ملتی ہے۔

ایک اور اہم اور قابل ذکر چیز جو مغرب کے قانون بین الاقوام کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہاں قانون کے بنیادی اصول و تصورات بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے، قانون کی کتابیں کچھ عرصے کے بعد قابل اصلاح و ترمیم ہو جاتی ہیں اور دو ایک عشرے گزرنے کے بعد یہ کتابیں دفتر بے معنی قرار دے کر داخل دفتر کر دی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس فقہ کے احکام کا وہ حصہ جو اسلامی قانون کے بنیادی ڈھانچے کی تشکیل کرتا ہے، وہ ایسا عالمگیر ہے کہ اس میں کسی تبدیلی و تنسیخ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تفصیلات ہمارے ہاں بھی بدل سکتی ہیں۔ رسوم و رواج کے بدلنے سے جزئیات میں تبدیلی ممکن ہے۔ احکام میں ارتقا و پیش رفت جاری رہتی ہے۔ لیکن قانون کا جو بنیادی ڈھانچہ ہے اور جو بنیادی تصورات ہیں وہ قرآن و سنت میں محفوظ ہیں جو ہر قسم کے تغیر و تبدل سے ماورا ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی تصنیف "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں تغیر و ثبات کے درمیان جو ہم آہنگی اسلام نے قائم رکھی ہے اس کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا کے بعض قوانین وہ ہیں اور بعض نظام و تصورات

ایسے ہیں جو صرف تغیر پر مبنی ہیں۔ جیسا کہ آج کے دور میں وضع قانون کے سلسلے میں آپ دیکھتے ہیں کہ روز قوانین اور تصورات میں تبدیلیاں لائی جاتی ہیں اور کچھ قوانین وہ ہیں جو صرف ثبات پر مبنی ہیں۔ جو لوگ یا قوم صرف ثبات پر زور دیتی ہے اس کے لیے حالات کا ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے اور جو قومیں اپنے نظام اور قانون کے بنیادی تصورات کو بدلتی رہیں ان کے ہاں قانون میں کوئی ثبات اور دوام نہیں رہتا۔ اور یہ چیز قانون کے تشخص کو ختم کر دیتی ہے۔ اسلام نے دونوں کا خیال رکھا ہے۔ اس میں تشخص کا تحفظ بھی ہے، ثبات و دوام کی ضمانت بھی، اور بدلتے ہوئے حالات کی رعایت بھی۔ قرآن و سنت کے نصوص تسلسل اور تشخص کی ضمانت فراہم کرتے ہیں اور اجماع و اجتہاد کے ذریعے تغیر کے تقاضوں کو سمویا گیا ہے۔ قرآن پاک کا یہ اصولی توازن اور نظری اعتدال جہاں داخلی قوانین میں دکھائی دیتا ہے وہاں وہ بین الاقوامی قوانین میں بھی نظر آتا ہے۔

اسلامی بین الاقوامی قانون کا ایک اہم اصول اور اساسی تصور "مجازات" ہے۔ بین الاقوامی لین دین میں یہ سوال بڑا اہم ہے کہ برابری اور مساوات کیا ہے اور برابری کی سطح پر لین دین کیسے ہوتا ہے۔ جو سلوک آپ اپنے ساتھ کرتے ہیں وہی سلوک دوسروں کے لیے بھی ہے۔ بشرطیکہ وہ سلوک شریعت کے احکام کی رو سے جائز اور انسانی احترام سے ہم آہنگ ہو، اور اخلاق و کردار کے اسلامی تصورات پر پورا اترتا ہو۔ اس حد تک معاملہ برابری کی سطح پر رکھا جائے گا۔ اس اصول کی بنیاد پر فقہاے کرام نے بہت سے قوانین مرتب کیے ہیں۔ لیکن "مجازات" کے اصول کو ایک طویل عرصے تک مغربی مفکرین نے تسلیم نہیں کیا۔ آج بھی مغربی دنیا کے بیشتر ممالک برابری کے اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ آج بھی وہ اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ مشرق و مغرب کے درمیان "مجازات" کا اصول کارفرما ہو۔ دنیاے اسلام اور دنیاے مسیحیت کے درمیان "مجازات" انھیں آج بھی قبول نہیں۔ آج بھی ان کا نظام جیسا کہ ادارہ اقوام متحدہ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے، کچھ خاص اقوام اور نسلوں کی برتری پر قائم ہے، جس میں ایک نسل کا نمائندہ پوری نسل انسانیت کے فیصلے کو ویٹو کر سکتا ہے۔ ویٹو کا یہ تصور صاف صاف بتاتا ہے کہ نسل انسانی کے درمیان مساوات انھیں آج بھی قبول نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ عدم مساوات کا یہ تصور محض ایک اتفاق ہے یا محض وقتی سیاسی حقائق کا ایک مظہر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی ان اقوام نے اسے ایک قانون بلکہ مذہبی فتوے کی شکل دے دی ہے، ایسا فتویٰ جسے انھوں نے اپنے قانون میں باقاعدہ ایک ضابطے کی شکل دے دی ہے۔ یہودیوں کے ہاں گوئیم کا فلسفہ ہے، ہندوؤں کے ہاں ملیچھ کا تصور ہے، ہندوؤں میں چار ذاتوں کا تصور ہے، اسی طرح ارسطو کے ہاں جو نسلی تفریق اور امتیاز ہے اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔

اس کے ساتھ ایک اور بڑا نمایاں فرق جو مغرب کے بین الاقوامی قانون میں اور اسلام کے قانون بین

الاقوام میں پایا جاتا ہے، وہ قانون کی قوت نافذہ کا معاملہ ہے، وہ قوت نافذہ جس کے بل بوتے پر کسی قانون کو نافذ کیا جاتا ہے اور جس کے بھروسے پر قانون کی حاکمیت پر لوگوں کا اعتماد قائم ہوتا ہے۔ اس امر کے باوجود کہ دنیا میں ایک ہزار سال سے مغرب کا یہ بین الاقوامی قانون رائج رہا ہے، اس حقیقت کے باوجود کہ Law of Nations کو انھوں نے خود ہی مرتب کیا، اس امر کے بلوصف کہ مغربی زبانوں میں بین الاقوامی قانون پر ہزارہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس حقیقت کے باوجود کہ آج کہنے کو وہاں ایک بین الاقوامی عدالت انصاف بھی موجود ہے، اس امر کے باوجود کہ وہاں سلامتی کونسل جیسا بااثر ادارہ بھی موجود ہے، جس کے بارے میں دعویٰ یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی قانون کے احکام پر عمل درآمد کراتا ہے، لیکن اس تمام تر مساعی کے باوجود اہل مغرب کو خود اپنے قانون بین الاقوام پر ابھی تک اطمینان کلی حاصل نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک حتمی طور پر یہ طے نہیں کر سکے کہ یہ قانون ہے بھی یا نہیں۔

بات یہ ہے کہ قانون کا ان کے ہاں اپنا ایک تصور ہے۔ قانون کے بارے میں مغربی مفکرین نے جو کچھ لکھا ہے، وہ قانون کا طالب علم جانتا ہے۔ ان کے ہاں کچھ لوگوں کے نزدیک قانون سے مراد اصول و ضوابط کا وہ مجموعہ ہے جس کو کوئی بالاتر قوت دوسروں پر نافذ کرے۔ مشہور انگریز قانون دان، جان آسٹن نے لکھا ہے کہ قانون حاکم اعلیٰ کے حکم کا نام ہے۔ بعض نے کہا کہ قانون وہ ہے جسے کوئی عدالت نافذ کرے۔ اس کے بعد ماضی قریب میں ایک قانون دان، کیلسن نے بیان کیا کہ کسی بالادست اور طاقتور حکمران کا حکم قانون ہے۔

اگر قانون کی ان تعریفات کو مدنظر رکھا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بین الاقوامی معاملات اور بین الممالک لین دین میں ان بنیادوں پر کوئی قابل عمل ضابطہ تشکیل دیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہ بین الاقوامی قوانین کے احکام کسی دنیاوی بالادست حاکم کے دیے ہوئے ہیں اور نہ ان کے نفاذ کا کوئی موثر بندوبست موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین اور قانونی ماہرین کی ایک خاصی تعداد ایسی ہے جس نے بین الاقوامی قانون کو سرے سے قانون ہی تسلیم نہیں کیا۔ کسی نے کہا بین الاقوامی قانون، قانون کا نقطہ زوال ہے۔ کسی نے کہا کہ قانون بین الاقوام کو قانون کہنا تکلف ہے۔ کسی نے کہا:

International law is merely an international morality.

کہ بین الاقوامی قانون محض بین الاقوامی اخلاق ہے۔ ان نظریات کی پشت پر جو اصل وجہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون خود ان کے اپنے تصور قانون کی رو سے قانون کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ نہ اس کو کسی بالاتر قوت نے نافذ کیا، نہ اس کی پشت پر کوئی عدالتی نظام ہے کہ خلاف ورزی کرنے والے کو سزا دے سکے، نہ اس کے نفاذ کے لیے کوئی قوت حاکمہ موجود ہے۔ اس لیے اس کو قانون تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ اگرچہ وہاں بعض قانون دان اسے قانون مانتے اور کہتے ہیں۔ یہ بحث وہاں رہی ہے اور اب بھی جاری ہے۔

اسلام کے قانون بین الممالک کی طرف آیئے تو یہاں فقہا کے ہاں کبھی یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوا کہ اسلام کا قانون بین الاقوام یعنی "سیر قانون" ' قانون ہے یا نہیں۔ اسلام میں جس طرح مسلمان اللہ پر ایمان رکھنے کا پابند ہے، اسی طرح وہ قانون بین الاقوام کے احکام پر عمل کرنے کا بھی پابند ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جس طرح ایک مسلمان زکوٰۃ اور حج ادا کرنے کا پابند ہے، اسی طرح سے مسلمان "سیر کے احکام" کی پابندی کرنے کا بھی پابند ہے۔ جس طرح ایک مسلمان شراب نوشی کو حرام سمجھتا ہے، اسی طرح سے ایک مسلمان معاہدے کی خلاف ورزی کو بھی حرام سمجھتا ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کے ہاں جہاں تک "احکام سیر" کی پابندی اور ان کے واجب التعمیل ہونے کا تعلق ہے۔ بالفاظ دیگر جہاں تک اس کی اندرونی قوت نافذہ (inner sanction) کا تعلق ہے، وہ دونوں قسم کے احکام پر یکساں محیط ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے ہاں یہ اختلاف کبھی پیدا نہیں ہوا جو یورپ میں پیدا ہوا ہے۔ فتح سمرقند کی مثال ہمارے سامنے ہے، جہاں اسلام کے بین الاقوامی قانون کو میونسپل لا کی طرح ایک مسلمان عدالت نے باقاعدہ نافذ کیا، اور اس کی پابندی کروائی گئی۔ یہاں ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی کہ ایک حاکم مطلق فرماں روا جو بہت بڑی سلطنت کا مالک ہے اور جس کی طاقت اور رعب سے ایک دنیا خائف رہتی ہے، اس کی فاتح اور جہاں گیر فوجوں کو ایک عالم کا فتویٰ روک دیتا ہے۔ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ایک صحابی حضرت عمروؓ بن عنبسہ نے ایک واقعہ وقوع پذیر ہوتے دیکھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس واقعہ میں اسلام کے قانون بین الاقوام کی خلاف ورزی کا امکان ہے۔ انھوں نے ایک حدیث نبویؐ بیان کی اور بڑھتی ہوئی فوجیں واپس چلی گئیں۔ یہ ہے اسلام کے قانون اور شریعت کی رو سے قانون بین الممالک کا اسلامی تصور۔ اس لیے مسلمانوں کے ہاں قانون بین الممالک کی تشریح و تعیین میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ یہ ہمیشہ سے ایک باقاعدہ اور مکمل قانون تھا اور اب تک ایک باقاعدہ اور مکمل قانون چلا آتا ہے۔

اس تقابلی جائزے سے واضح ہوا ہے کہ قانون سے متمتع ہونا اور اس کے فوائد حاصل کرنا دنیا میں صرف اور صرف طاقتور کے لیے ممکن تھا۔ کمزور کے لیے کوئی قانون نہ تھا۔ صرف حاکم کے صوابدیدی اختیارات ہوتے تھے، جو حاکم کے ذاتی طور پر مہربان ہونے کی صورت میں کمزور کا مداوا کرتے تھے، ورنہ نہیں۔ طاقتور کے لیے سارے قانون اور مراعات تھیں اور آج بھی ہیں۔ might is right کا قانون پہلے بھی چلتا تھا، اور آج بھی چلتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام کے قانون بین الممالک کی بات ہو یا میونسپل لا کی، یہ صرف کمزور کے حقوق کے تحفظ کے لیے ہے۔ اسلامی قانون کے ایک مجتہد اعظم، اسلامی شریعت کے سب سے بڑے مزاج شناس اور اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے حاکم نے اسلامی قانون کی اس خصوصیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا: "تم میں جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک طاقتور ہے جب تک میں اس

کا حق اس کو نہ دلوا دوں، اور تم میں سے جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک کمزور ہے جب تک وہ حق ادا نہ کرے"۔ اسی لیے قانون کی روح یہ ہونی چاہیے کہ وہ کمزور کا محافظ ہو، نہ کہ طاقتور کا۔ اسلام کے قانون بین الاقوام نے ہمیشہ کمزوروں کو قوت فراہم کی، اس نے ہمیشہ مظلوموں کو انصاف دیا۔ اگر قانون کی طاقت بھی طاقتور کی تائید کرنے لگے تو کمزوروں اور مظلوموں کے سارے سہارے ختم ہو جائیں۔ قانون کی حقانیت اور عدل گستری کی یہ سب سے بڑی ترازو ہے جو صدیق اکبرؓ نے آج سے چودہ سو سے زائد سال قبل ہمیں دی تھی۔ اس ترازو پر اسلام کا قانون ہی پورا اترتا ہے۔

یہ وہ چند بنیادی مسائل ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کا قانون بین الممالک اور دیگر اقوام کے قانون بین الممالک میں کیا بنیادی فرق ہے؟ وہ کون سے امتیازی اوصاف ہیں جو اسلام کے قانون کو دیگر اقوام کے قانون سے ممیز کرتے ہیں؟ انسانیت کے لیے فلاح و بہبود دنیا کے دیگر قوانین میں کتنی ہے، اور اسلام کے قانون میں کتنی ہے؟ اسلام کے قانون بین الاقوام یا میونسپل لا دونوں کے سلسلے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان اگر اللہ کے ہاں حضوری اور جواب دہی کا احساس رکھتا ہو، اور اسوہ رسولؐ کے زیر سایہ اس کی تربیت ہوئی ہو تو اس کے اندر تعمیل قانون کے لیے ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جس کی موجودگی میں کسی اور قوت قاہرہ کی ضرورت نہیں رہتی جو انسان سے قانون کی تعمیل کرائے۔ یہی اسلام کے قانون کا وہ طرۂ امتیاز ہے جو اسلام کے قانون کو دیگر بین الاقوامی قوانین سے ممتاز کرتا ہے۔

نیک خواہشات کے ساتھ
منجانب

TATA TEXTILE MILLS LTD.
ISLAND TEXTILE MILLS LTD.
SALFI TEXTILE MILLS LTD.
TATA ENERGY LTD.
8,8TH FLOOR, TEXTILE PLAZA,
M.A. JINNAH ROAD,
KARACHI - 74000
PAKISTAN.

Ph : (H O) 242-6761 (3 LINES)
(DIR) 2426202, Fax: 2417710
LANDHI : 7738228, Fax. 7738637,
KOTRI : 870932 870979,
870237, Fax: 870260
MUZAFFAR GARH 32062 Fax 32662
Mobile . 0342 -335814
Home (KAR) 4542090 - 4547515